9

# نیک وہی ہیں جو عُسر اور یُسر دونوں حالتوں میں خدا تعالیٰ کے منشاء کو پورا کرنے کی کوشش کریں

(فرمودہ 14 مارچ 1941ء)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ کے قرآن کریم سے دو نام معلوم ہوتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اس کے دو ہی نام ہیں بلکہ یہ ہے کہ جس مضمون کے متعلق میں اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں اس کے متعلق دو نام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ 1 ہے۔ یعنی وہ قبض کرتا ہے اور پھر بسط بھی کرتا ہے۔ یعنی کبھی تو اپنے بندوں سے اس کا معاملہ اس قسم کا ہوتا ہے کہ وہ ان کے ساتھ مہربانی، شفقت اور رحم سے پیش آتا ہے، ان کو ترقیات بخشتا ہے، ان کے کاموں میں برکت دیتا ہے اور ان کی کوششوں کے اعلیٰ درجہ کے نتائج پیدا کرتا ہے اور کبھی اس کے قابض ہونے کی صفت ظہور میں آتی ہے اور وہ اپنے بندے پر تکالیف، ابتلاء اور مصائب نازل کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ان ابتلاؤں اور تکالیف کے زمانہ میں اس کے بندے کا معاملہ کیسا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ افراد اور اقوام دونوں کے متعلق ہوتا ہے مومنوں کے ساتھ یا مومن جماعتوں کے ساتھ۔ اس کا معاملہ کبھی تو قبض کا اور کبھی بسط کا ہوتا ہے۔ یا تو وہ قبض کے بعد بسط کا سلوک

کرتا ہے یا یہ دونوں معاملے بدلتے رہتے ہیں اور اگر وہ کبھی لمبے زمانہ تک قبض کا معاملہ کرتا ہے تو آخر میں ضرور بسط کا معاملہ کرتا ہے اور انجام کار کشائش عطا کر دیتا ہے اور بالعموم انجام اچھا ہوتا ہے۔ سوائے اس کے کہ دنیا کے مصائب اس کے علم میں اس مومن کے لئے آخرت کے لحاظ سے بہتر ہوں۔ ایسی حالت میں تو بعض اوقات انجام بھی تکلیف کا ہی ہوتا ہے۔ مگر اس کا عام طریق یہی ہے کہ مومن سے وہ ابتداءً قبض کا اور آخر کار بسط کا معاملہ کرتا ہے اور مومن جماعتوں سے بھی عام طور پر اس کا معاملہ اسی رنگ میں ہوتا ہے۔ یعنی ابتداءً قبض کا ہوتا ہے مگر آخر ایک دن ایسا آتا ہے کہ بسط کا معاملہ ہو جاتا ہے اور ترقیات عطا کر دیتا ہے اور ان دونوں حالتوں میں وہ اپنے بندے کا امتحان کر کے دنیا کو دکھاتا ہے کہ دیکھو میرا بندہ دونوں حالتوں میں اچھا رہا۔ دنیا میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ وہ مصیبت کے ایام میں زیادہ اچھے اور شاندار اعمال کرتے ہیں مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مصائب کے وقت گھبرا جاتے ہیں اورخوشیوں کے زمانہ میں اچھے رہتے ہیں۔ یہ دراصل فطری نقائص ہوتے ہیں ان کو نیکی نہیں کہا جا سکتا۔ بعض کی بناوٹ ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب ان پر مصیبت کا وقت آئے تو ان کے اخلاق نمایاں طور پر اُبھر آتے ہیں یا جب خوشی کا وقت آئے تو ان کے اخلاق زیادہ اُبھر آتے ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو کھانے کو ملتا رہے، بیوی بچے اچھے رہیں تو وہ خوب نمازیں پڑھتے، روزے رکھتے اور نیک اعمال بجا لاتے ہیں لیکن جب ذرا بھی مصیبت آ جائے تو نمازیں چھوڑ دیتے ہیں، روزہ رکھنا ترک کر دیتے ہیں اور کہنے لگ جاتے ہیں کہ بس بہت نمازیں پڑھ کر اور روزے رکھ کر دیکھ لیا ہے کچھ نہیں بنتا۔ لیکن بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ جونہی ذرا کھانے کو ملا نمازوں میں سست ہو جاتے ہیں، نیک اعمال سے غافل ہو جاتے ہیں، لیکن جب کوئی گھر میں بیمار ہوا فوراً مصلّٰی بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن نہ تو وہ لوگ جو خوشی کے وقت میں اچھے اخلاق دکھاتے اور اپنی حالت کو درست رکھتے ہیں شریعت یا اخلاق کے مطابق عمل کرنے والے ہوتے ہیں

اور نہ وہ جو مصیبت کے وقت ایسا کرنے والے ہوتے ہیں بلکہ مومن کا کمال یہ ہوتا ہے کہ خوشی اور مصیبت دونوں وقت خدا تعالیٰ کو راضی رکھنے کی کوشش کرے اور اس کے منشاء کو پورا کرے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فطرت پر عمل کرنے والے نہیں بلکہ شریعت پر عمل کرنے والے ہیں۔ فطرت کے مطابق عمل کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس انسان میں استقلال نہیں۔ جب تک حالات اس کی فطرت کے مطابق ہوں وہ ٹھیک چلتا جاتا ہے اور جب حالات میں تبدیلی ہو نیکی کو چھوڑ دیتا ہے۔ جس شخص کی فطرت ایسی ہے کہ وہ خوشی میں خدا تعالیٰ کو یاد کرتا ہے جب تک حالات اس کی فطرت کے مطابق ہوں یعنی خوشی اور راحت کے سامان پیدا رہیں وہ ایسا کرتا ہے مگر جب حالات اس کی فطرت کے مطابق نہ رہیں وہ خدا تعالیٰ کو بھول جاتا ہے یا جس کی فطرت ایسی ہے کہ مصیبت کے وقت میں اسے خدا تعالیٰ یاد آتا ہے جب تک اس پر مصائب رہیں وہ خدا تعالیٰ کو یاد رکھتا ہے مگر جب ذرا خوشی کا زمانہ آئے وہ سمجھ لیتا ہے کہ نمازوں وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایسے لوگ گویا اندھا دھند اپنی فطرت کے مطابق چلتے جاتے ہیں اور نتائج کو مدنظر نہیں رکھتے اور جب وہ اس راستہ سے ہٹ جائیں جو ان کی فطرت کے مطابق ہے تو وہ حیران و پریشان ہو جاتے ہیں اور قوت عملیہ بالکل معطل ہو کر رہ جاتی ہے لیکن جو شخص سوچ سمجھ کر کام کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ سب حالتیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اس لئے ہر حال میں اس کے منشاء کے مطابق چلنے کی کوشش کرتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام کو ابتداءً ہر قسم کے مصائب پیش آئے اور پھر ہر قسم کی ترقیات بھی حاصل ہوئیں مگر انہوں نے دونوں حالتوں میں خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کی کوشش کی اور یہ امر بتاتا ہے کہ ان کی نیکیاں اپنے فطری میلان کے مطابق نہ تھیں بلکہ خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے تھیں۔ مکہ کی زندگی میں ان پر کتنی مصیبتیں آئیں ان کا خیال کر کے بھی انسان کانپ جاتا ہے۔ آپ لوگ غور کریں کہ کتنے ہیں جو ایسے مصائب کو برداشت کر سکتے ہیں؟ ان کو گرم ریت پر

عین دوپہر کے وقت لٹا دیا جاتا اور پھر رسیاں باندھ کر گھسیٹا جاتا اور کنکریلی زمین پر بے تحاشہ کھینچا جاتا تھا حتّٰی کہ جسم سے خون بہنے لگتا مگر وہ سب کچھ صبر سے برداشت کرتے اور یہ حالت ایک لمبے عرصہ تک جاری رہی۔ ایک صحابی کے متعلق لکھا ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے غسل کے لئے اپنا کرتا اتارا تو اس وقت کچھ اَور لوگ بھی وہاں تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی پیٹھ کا چمڑا بالکل بھینس کے چمڑے کی طرح سخت، کُھردرا اور سیاہ تھا۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کیا یہ کوئی بیماری ہے تو اس صحابی نے بتایا کہ بیماری کوئی نہیں بلکہ جب ہم اسلام لائے تو ہمارے مالک (یہ سلوک عام طور پر غلاموں سے کیا جاتا تھا) ہم کو تپتی ہوئی ریت پر ننگا کر کے دوپہر کے وقت لٹا دیتے تھے اور اس سے خون پک پک کر جل گیا اور یہ حالت ہو گئی2 اور اگر ان کا زمانہ اس پر ختم ہو جاتا تو کوئی کہہ سکتا تھا کہ بعض لوگ طبعاً ضدی ہوتے ہیں اور ان کو جتنا ڈانٹا اور دبایا جائے وہ اتنا ہی زیادہ مقابلہ کرتے ہیں۔ اس لئے صحابہ کی یہ حالت کسی نیکی کی وجہ سے نہ تھی بلکہ ان کے فطری میلان کے مطابق تھی۔ ان کی فطرت ہی ایسی تھی۔ اس لئے جب ان پر ظلم ہوئے تو وہ مقابلہ کے لئے کھڑے ہو گئے مگر پھر اللہ تعالیٰ اسلام کا زمانہ لایا اور مسلمانوں کو غلبہ اور فتوحات حاصل ہوئیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں نے اس وقت بھی اسی تقویٰ کا نمونہ دکھایا اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسری نیکیوں میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ اسی طرح قربانیاں کرتے رہے۔ اس لئے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ضدی طبیعت کے تھے بلکہ ماننا پڑتا ہے کہ مصائب کے وقت میں بھی وہ خدا تعالیٰ کی خاطر نیک اعمال بجا لاتے تھے اور خوشیوں میں بھی اسی کے لئے نیکیاں کرتے تھے۔ یا اگر اللہ تعالیٰ شروع سے ہی اسلام کو مدنی زندگی عطا کر دیتا ادھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعویٰ کرتے اور ادھر خدا تعالیٰ کی تائید و نصرت حاصل ہو جاتی تو صحابہ کے نیک نمونہ کو دیکھ کر کوئی کہہ سکتا تھا کہ ان لوگوں کو آرام پہنچا اس لئے وہ نیکیاں کرتے رہے۔ کیا پتہ کہ اگر ان کو مصائب پیش آتیں تو ان کا ایمان کیسا رہتا۔ ان کی طبیعت ہی ایسی تھی

کہ خوشی میں خدا تعالیٰ کو یاد کرنے والے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو دونوں زمانے دیئے اس لئے کوئی یہ اعتراض نہیں کر سکتا اور ان کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہر ایک کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا تقویٰ اور دینداری کے ماتحت کیا۔ کیونکہ دونوں حالتوں میں خدا تعالیٰ کو نہ چھوڑا۔

مجھے اس امر کی ایک مثال یاد آئی ہے کہ کس طرح بعض لوگ نرمی سے ہر قسم کا کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں مگر ذرا سی سختی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں یہاں ایک شخص جو عرب کہلاتے تھے آئے۔ وہ رہنے والے توبرما کے تھے مگر عرب کہلاتے تھے۔ ابو سعید ان کا نام تھا وہ یہاں رہے مگر بعد میں کچھ ابتلاء آیا اور چلے گئے۔ پھر سیاسی آدمی بن گئے اور ہندوستان سے شاید ترکی چلے گئے تھے اور غالباً وہیں فوت ہو گئے۔ بہر حال پھر کبھی ان کا ذکر نہیں سنا۔ وہ بڑے اخلاص سے یہاں آئے تھے مگر بعد میں بعض باتوں کی وجہ سے ابتلاء آ گیا اور چلے گئے۔ جب آئے تو اس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر گورداسپور میں ایک مقدمہ[3] شروع ہو گیا جو مولوی کرم دین بھیں والے کے مقدمہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے سلسلہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اکثر گورداسپور جانا پڑتا تھا اور آپ بعض اوقات دس دس پندرہ پندرہ دن بلکہ مہینہ مہینہ وہاں رہتے تھے۔ وہ بھی ساتھ رہتے اور خواجہ کمال الدین صاحب اور دوسرے لوگ جو مقدمات کا کام کرتے تھے ان سے خوب خدمت لیتے تھے اور وہ بڑی خدمت کرتے تھے۔ حتّٰی کہ مجھے بعض لوگوں نے سنایا کہ وہ ان کے پاخانہ والے پاٹ بھی دھو دیتے تھے۔ حالانکہ وہ کسی زمانہ میں اچھے تاجر اور آسودہ حال آدمی رہ چکے تھے لیکن ایک دن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مجلس میں تشریف فرما تھے مَیں بھی وہیں تھا۔ خواجہ صاحب آئے شاید اپنے لئے یا شاید ان کے ساتھ کوئی ایسا آدمی تھا جس سے وہ اچھا سلوک کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کہا کہ عرب صاحب وہ چٹائی گھسیٹ کر ادھر لے آیئے مگر خواجہ صاحب کا لہجہ قدرے تحکمانہ تھا اور طریقِ خطاب میں کچھ حقارت کا رنگ بھی تھا۔ اس لئے ان کے جواب میں عرب صاحب نے باوجودیکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ و السلام

بھی وہیں تشریف رکھتے تھے۔ بڑے جوش سے کہا کہ کیا مَیں تمہارے باپ کا نوکر ہوں۔ گویا جو شخص محبت سے پاخانہ تک اٹھا دیتا تھا جب اسے خطاب کرتے وقت حکومت کا رنگ آیا تو اس کی فطرت نے بغاوت کی اور اس نے بڑے جوش سے کہا کہ کیا مَیں تمہارے باپ کا نوکر ہوں۔ اس کے بالمقابل بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ محبت سے نہیں مانتے۔ مگر جب ان کو ماراجائے تو بڑے فرمانبردار ثابت ہوتے ہیں۔ مگر جونہی ان سے نرمی کا برتاؤ کیا جائے فوراً بگڑ جاتے ہیں۔ اس کی بھی ایک مثال مجھے یاد آ گئی ہے وہ شخص ابھی زندہ ہے جب وہ بچہ تھا اور غالباً یتیم تھا۔ ہمارے نانا جان مرحوم اس جوش میں کہ اسے پالیں گے اور اس طرح ثواب حاصل کریں گے اسے گھر میں لے آئے۔ اور باوجودیکہ آپ کی طبیعت بڑی جوشیلی تھی ثواب حاصل کرنے کے شوق میں اس کی بہت خاطرو مدارت کرنے لگے۔ اسے کھلائیں، پلائیں، اس کے لئے بستر کریں اور پھر اسے سلائیں۔ ایک دو روز تو وہ ٹھیک طرح کھاتا پیتا رہا مگر تیسرے چوتھے روز اس نے بگڑنا شروع کیا۔ میر صاحب مرحوم اسے کہیں کھانا کھا لو تو وہ کہے مَیں نہیں کھاؤں گا۔ نماز کے لئے چلو تو کہے نہیں جاؤں گا حتّٰی کہ اس نے کھانا چھوڑ دیا۔ اب میر صاحب مرحوم کھانا لے کر بیٹھے ہیں کہ میاں کھا لو بڑی خوشامد کر رہے ہیں مگر وہ یہی کہتا جاتا ہے کہ نہیں مَیں نہیں کھاؤں گا۔ شام کے کھانے کا وقت اس طرح گزرا اور اس نے نہ کھایا۔ صبح ہوئی تو پھر آپ نے اسی طرح اس کی خوشامد شروع کی کہ میاں فضل الٰہی کھانا کھا لو تمہیں اچھے کپڑے بنوا دیں گے، یہ لے دیں گے، وہ لے دیں گے مگر اس نے ایک نہ مانی اور اپنی ضد پر اَڑا رہا۔ اور اس طرح دوسرا وقت بھی فاقہ سے ہی رہا۔ تیسرا وقت آیا تو پھر یہی حالت رہی۔ بہت منت خوشامد کی مگر اس نے ایک نہ مانی۔ نانا جان مرحوم کی طبیعت جوشیلی تو تھی ہی آخر ان کو جلال آ گیا اور انہوں نے سوٹی لے کر کہا کہ کھاتا ہے یا نہیں؟ جب اس نے دیکھا کہ آپ مارنے لگے ہیں تو جھٹ کہنے لگا کہ مَیں کھانا کھا لیتا ہوں۔ تین وقت کی منت و سماجت سے تو

نہ کھایا مگر جب دیکھا کہ مار پڑنے لگی ہے تو جھٹ کھا لیا اور اس دن سے خوش رہنے لگا۔

تو بعض طبائع مار کے آگے جھکتی ہیں اور بعض پیار کے آگے مگر یہ دونوں طاقتیں نیکی نہیں کہلا سکتیں۔ یہ فطرت کی مختلف حالتیں ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو اپنا محسن سمجھتا اور خواہ وہ پیار کرے یا ناراض ہو اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا تو یہ نیکی ہے۔ کیونکہ اس نے دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق ثابت کر دیا۔ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں ایک دفعہ منافقین کی طرف سے یہ افواہیں بہت زور سے پھیلائی گئیں کہ روما کا قیصر مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے فوجیں جمع کر رہا ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ سن کر رسول کریم ﷺ اس کے مقابلہ کے لئے جائیں گے اور جاتے ہی حملہ کر دیں گے اور اس طرح مسلمانوں اور رومیوں میں لڑائی شروع ہو جائے گی۔ یہ منافقین کی ایک شرارت تھی۔ رسول کریم ﷺ کو یہ افواہیں پہنچیں تو آپ نے حکم دیا کہ بجائے اس کے کہ رومی ہم پر چڑھ آئیں اور حملہ کر دیں ہمیں چاہئے کہ سرحد پر ہی جا کر ان کو روکیں۔ آپ نے مسلمانوں کو تیاری کا حکم دیا۔ حکم بڑا سخت تھا کہ کوئی پیچھے نہ رہے۔ بیس ہزار کے قریب لشکر تیار ہوا جسے لے کر آپ روانہ ہوئے۔ سب مسلمان ساتھ گئے صرف منافقین پیچھے رہ گئے یا تین مسلمان۔ ان میں سے ایک اپنا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ مَیں نے سمجھا کہ میں تیاری کر لوں۔ رسول کریم ﷺ تو فوراً چل پڑے تھے مگر میں نے سمجھا مَیں امیر آدمی ہوں سامان رکھتا ہوں کل چلوں گا تو جا ملوں گا۔ دوسرے روز بھی اسی خیال میں رہا کہ کیا ہے۔ کل چل کر بھی مل سکتا ہوں مگر تیسرے دن بھی نہ جا سکا اور چونکہ حالات خطرناک تھے۔ رسول کریم ﷺ اس قدر تیزی سے بڑھتے جاتے تھے کہ تین دن کے بعد میں نے سمجھا کہ اب نہیں مل سکتا اور رہ گیا۔ رسول کریم ﷺ واپس تشریف لائے تو جو لوگ نہیں گئے تھے ان کی حاضری کا حکم دیا۔ ایک ایک غیر حاضر آپ کے سامنے جاتا۔ آپ نہ جانے کی وجہ پوچھتے وہ

کوئی عذر پیش کر دیتا آپ ہاتھ اٹھا کر اس کے لئے دعا کر دیتے اور اسے رخصت کر دیتے۔ مَیں بھی پہنچا تو جو صحابی پہرے پر تھے ان سے دریافت کیا کہ اب تک کیا ہؤا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس طرح لوگ جاتے ہیں عذر پیش کر دیتے ہیں رسول کریم ﷺ ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے اور پھر رخصت کر دیتے ہیں۔ یہ سن کر میرے دل میں خیال آیا کہ یہ تو چھٹکارے کی آسان راہ ہے۔ مَیں بھی کوئی عذر کر دوں گا مگر پھر خیال آیا کہ معلوم کروں کہ کوئی ایسے بھی ہیں جنہوں نے عذر نہ کیا ہو۔ میں نے پوچھا تو اس صحابی نے بتایا کہ ہاں فلاں فلاں دو شخص ایسے ہیں جنہو ں نے کوئی عذر نہیں کیا اور کہہ دیا ہے کہ ہم سے غلطی ہوئی اور ہم قصور وار ہیں اور مَیں نے دیکھا کہ وہی دو مخلص تھے۔ باقی عذر کرنے والے سب ایسے تھے جن کو ہم پہلے ہی منافق سمجھتے تھے اور مَیں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں بھی مخلصین کے ساتھ رہوں گا۔ چنانچہ میں پیش ہوُا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ مالکؓ تم بھی نہیں گئے۔ کیا عذر تھا۔ میں نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! کوئی عذر نہ تھا۔ صرف نفس کا دھوکا تھا۔ آپ نے فرمایا تم ٹھہرو تمہارے متعلق بعد میں فیصلہ کیا جائے گا اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم کے مطابق آپ نے ان تینوں کے بائیکاٹ کا اعلان فرمایا اور حکم دیا کہ کوئی شخص ان سے سلام کلام نہ کرے۔ پھر کچھ دن کے بعد حکم دیا کہ ان کی بیویاں بھی ان سے قطع تعلق کر لیں۔ مالکؓ کہتے ہیں کہ میری بیوی نے کہا کہ فلاں کی بیوی نے اجازت لے لی ہے تم کہو تو میں بھی لے آؤں۔ میں نے کہا کہ وہ تو کمزور اور بیمار ہے اس وجہ سے اس کی بیوی نے اجازت لی ہے۔ میں کوئی اجازت لینا نہیں چاہتا اور چونکہ خطرہ ہے کہ کسی وقت تم مجھے بلا لو یا مَیں تمہیں بلا لوں اس لئے تم اپنے میکے چلی جاؤ تا یہ حکم پوری طرح ادا ہو سکے۔ وہ کہتے ہیں میرے دل میں ایک درد تھا، دکھ تھا کہ منافق تو سزا سے بچ گئے اور ہمیں سزا مل گئی۔ کہیں یہ تو بات نہیں کہ ہم پر بہت بڑے منافق ہونے کا شبہ ہو۔ میرا ایک رشتہ دار تھا اور ہم دونوں میں باہم اس قدر محبت تھی کہ اکٹھے ہی کھانا کھاتے اور اکثر اکٹھے رہتے تھے۔ ایک دوسرے سے

گویا عشق تھا۔ جب یہ خیال میرے دل میں آیا تو وہ اپنے باغ میں کام کرتا تھا۔ مَیں گھبراہٹ کے عالم میں اس کے پاس گیا اور کہا کہ بھائی دیکھو اور لوگوں کو تو ہو سکتا ہے کہ اچھی طرح سب حالات معلوم نہ ہوں مگر تمہیں تو سب کچھ معلوم ہے۔ صرف یہ بتاؤ کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ مَیں منافق ہوں۔ مگر اس نے میری طرف مُنہ کر کے دیکھا بھی نہیں اور اپنے کام میں لگا رہا۔ میں نے پھر کہا کہ میں صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ تم تو میرے حال سے واقف ہو "کیا میں منافق ہوں"؟ مَیں چاہتا تھا کہ وہ کہہ دے نہیں اور میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے مگر اس نے پھر کوئی جواب نہ دیا اور آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ ایک ایسے شخص سے جو میرے حالات کا پوری طرح واقف تھا، رشتہ دار تھا اور اس سے نہایت گہرے تعلقات تھے یہ جواب سن کر گویا زمین اور آسمان مجھ پر تنگ ہو گئے اور مجھ پر جنون کی حالت طاری ہو گئی۔ یہاں تک کہ مَیں باغ کے دروازہ کی طرف بھی نہیں گیا بلکہ دیوار پھاند کر پاگلوں کی طرح شہر کو چل پڑا۔ جب میں شہر میں داخل ہوُا تو ایک یہودی نے کہا کہ ایک شخص تمہیں تلاش کرتا پھرتا ہے مَیں ذرا آگے بڑھا تو وہ ایک اور شخص سے میرا پتہ پوچھ رہا تھا اور وہ شخص میری طرف اشارہ کر کے بتا رہا تھا کہ وہ ہے۔ وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ یہ غسّان کے بادشاہ نے آپ کے نام خط بھیجا ہے۔ مَیں نے اسے کھولا تو اس میں لکھا تھا کہ میں نے سنا ہے تمہارے سردار نے تمہارے ساتھ بہت سختی کا معاملہ کیا ہے حالانکہ تم اپنی قوم کے سردار اور رئیس تھے تمہیں بہت ذلیل کن سزا دی گئی ہے جسے ہم بھی سخت ناپسند کرتے ہیں اور ہمیں تمہارے ساتھ بہت ہمدردی ہے اگر تم ہمارے پاس آ جاؤ تو ہم تمہاری شان کے مطابق عزت کریں گے۔ مالک کہتے ہیں یہ خط پڑھ کر مَیں نے کہا کہ شیطان کا آخری حملہ ہے۔ میں چلتا گیا آگے ایک تنور جل رہا تھا وہ خط میں نے اس میں ڈال دیا اور اس قاصد سے کہا کہ اپنے آقا سے کہہ دینا کہ تمہارے خط کا یہ جواب ہے۔ وہ کہتے ہیں مَیں نمازوں میں جاتا، جا کر اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہتا اور کان لگا کر

سنتا کہ شاید رسول کریم ﷺ نے جواب آہستہ دیا ہو۔ مگر جب معلوم کرتا کہ آپ نے جواب نہیں دیا تو تھوڑی دیر بیٹھ کر مجلس سے باہر چلا جاتا اور باہر یونہی تھوڑی دیر ادھر ادھر پھرنے کے بعد مجلس میں آتا اور پھر اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہتا اور رسول کریم ﷺ کے ہونٹوں کی طرف دیکھتا کہ شاید آپ نے آہستہ سے جواب دیا ہو مگر آپ جواب نہیں دیتے تھے ہاں یہ مَیں نے کئی دفعہ دیکھا کہ مَیں نظریں نیچی کئے بیٹھا ہوں۔ آنکھ اٹھا کر جو دیکھا تو رسول کریم ﷺ کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا اور یہ دن اسی طرح گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ غسّان کے خط کا واقعہ ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص کو دیکھ کر آنحضرت ﷺ کو الہام فرمایا کہ تینوں کو معاف کر دیا جائے۔ مالک کہتے ہیں کہ مَیں نماز پڑھ کر جلد گھر آ گیا تھا اور بعد میں مجلس میں آپ نے یہ فرمایا یہ سنتے ہی ایک صحابی تو گھوڑے پر سوار ہو کر مالک کو خبر دینے گئے مگر ایک ان سے بھی ہشیار نکلے اور انہوں نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا کہ مبارک ہو خدا تعالیٰ اور اس کے رسول نے تم کو معاف کر دیا۔ مالک کہتے ہیں یہ پیغام پہنچا تو مَیں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! آپ نے ہمیں معاف کر دیا؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ مَیں نے عرض کیا کہ اس معافی کے بعد میں سب سے پہلا کام یہ کرتا ہوں کہ میری دولت نے ہی مجھے غافل کر رکھا تھا۔ اس لئے مَیں ساری دولت اور جائداد خدا تعالیٰ کی راہ میں دیتا ہوں تا نہ یہ پاس ہو اور نہ پھر کبھی ایسی غفلت میں مبتلا ہو سکوں 4 اور اس کے بعد یہ خوشخبری پہنچانے والے کو اپنے کپڑے انعام دیئے اور خود کسی سے مانگ کر پہنے۔

تو دیکھو کس قدر مصیبت کے وقت میں شاندار اخلاص کا نمونہ دکھایا۔ آنحضرت ﷺ بیعت کے وقت یہ عہد لیتے تھے کہ عُسر یُسر دونوں حالتوں میں فرمانبرداری کروں گا اور ان لوگوں نے اس عہد کو پورا کر دکھایا۔ پس نیک وہی ہے جو خوشی اور مصیبت دونوں حالتوں میں خدا تعالیٰ کے منشاء کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کسی حالت میں بھی گھبراہٹ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے

دین سے سچا تعلق رکھتا ہے اور ہر حال میں خدا تعالیٰ کا ساتھ دیتا ہے۔یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ بھی ہر وقت ان کا ساتھ دیتا ہے۔اور ایسے ہی بہادر لوگ ہیں جو ہر حال میں قربانیاں کرتے ہیں۔جن کے ناموں کو دنیا ہمیشہ یاد رکھتی ہے۔مسلمانوں میں گرے ہوئے زمانہ میں بھی ایسے لوگوں کی کافی مثالیں پائی جاتی ہیں۔یہی لوگ حقیقی بہادر ہوتے ہیں۔بہادر وہ نہیں جو صرف تکلیف کے وقت قائم رہتا ہے۔یہ بہادری نہیں تہوّر کہلا سکتا ہے اور اسی طرح وہ بھی نہیں جو خوشی میں بات مانتا ہے۔اسے ہم صرف نرم اور کمزور دل کہہ سکتے ہیں۔بہادر وہی ہے جو نہ ڈر کے وقت ساتھ چھوڑتا ہے اور نہ خوشی کے وقت۔اسلامی تمدن کے زمانہ میں اس کی بہترین مثال سپین کے ایک سردار کی نظر آتی ہے۔سپین کو پہلی صدی کے آخر میں مسلمانوں نے فتح کر لیا تھا۔چنانچہ جبل الطارق جسے اب جبرالٹر کہا جاتا ہے ایک مسلمان جرنیل طارق بن زیادکے نام پر ہی ہے۔یہ یورپ اور امریکہ سے بحیرہ روم میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔بنو امیہ کے زمانہ میں ایک اسلامی لشکر افریقہ سے ہوتا ہوُا یہاں پہنچا اور ایسی ہمت کے ساتھ سپین کو فتح کیا کہ حیرت آتی ہے۔اس لشکر کی تعداد صرف بیس ہزار تھی۔جب یہ فوج کشتیوں سے اتری تو طارق نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ دیکھو ہم بہت تھوڑے ہیں سارا ملک ہمارا دشمن ہے۔لڑائی اگر شدید ہو تو ممکن ہے بعض کے دل میں یہ کمزوری پیدا ہو کہ لَوٹ جائیں۔اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم ان کشتیوں کو جلا دیں تا واپسی کا خیال ہی نہ رہے۔بعض نے کہا کہ یہ خطرہ کی بات ہے مگر طارق نے کہا کہ اگر ڈرنا تھا تو گھر سے ہی کیوں نکلنا تھا۔آخر کشتیاں جلا دی گئیں سپین پر حملہ کیا اور اس کے اکثر حصہ کو فتح کر لیا گیا اور وہاں ایک زبردست حکومت قائم کی اوربڑے بڑے فقیہہ اور علماء جن کے متعلق مسلمان یہ جانتے بھی نہیں کہ وہ عربی نہیں بلکہ یورپین تھے وہیں پیدا ہوئے ہیں۔

محی الدین ابن عربی بڑے بلند پایہ صوفی گزرے ہیں۔فتوحاتِ مکیہ ان کی مشہور کتاب ہے وہ یورپین اور سپین کے رہنے والے تھے۔اسی طرح بہترین تفاسیر

جو ہیں ان میں قرطبی فقہی مسائل کے لحاظ سے اور بحر محیط نحوی لحاظ سے بہترین تفسیریں سمجھی جاتی ہیں۔اس میں رطب و یابس اور لغو باتیں نہیں بلکہ قرآن کریم پر قرآن کریم سے بحث کی گئی ہے اور یہ دونوں مفسر یورپ کے رہنے والے تھے۔ابن حجر کا نام ایسا ہے جسے عام طور پر مسلمان جانتے ہیں۔ حضرت خلیفہ اول تو گویا ان کے عاشق تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ابن حجر اسلام کے لئے ننگی تلوار تھے یہ بھی سپین کے رہنے والے تھے۔تو سپین ایک زمانہ میں اسلام کا مرکز تھا کیا بلحاظ فقہی مسائل کی تحقیق و تدقیق کے اور کیا بلحاظ فقہ، علمِ کلام، تفسیر قرآن اور احادیث پر عبور کے۔ پھر دنیوی علوم میں سے طب، فلسفہ اور علم ادب کے لحاظ سے بھی وہاں چوٹی کے علماء گزرے ہیں لیکن عام لوگ غلطی سے سمجھتے ہیں کہ یہ سب بڑے بڑے علماء و فقہاء عرب اور بغداد وغیرہ کے رہنے والے تھے۔

سپین میں مسلمانوں کی حکومت آٹھ سو سال تک قائم رہی اور بڑی شان سے رہی۔ فرانس کے بعض علاقے بھی مسلمانوں نے فتح کئے۔یورپ کے بہت سے جزائر بھی ان کے قبضہ میں تھے، جنوبی اٹلی کے بعض حصوں پر بھی ان کی حکومت تھی۔ مگر یہ ساری حکومت آہستہ آہستہ باہمی مخالفتوں اور عداوتوں کی وجہ سے کمزور ہوتی گئی حتّٰی کہ صرف دار السلطنت غرناطہ اور اردگرد کے بعض دیہات تک ہی اسلامی حکومت محدود رہ گئی۔اس وقت سپین کے ایک حصہ کا بادشاہ فرڈیننڈ خامس اور ایک کی ایک عورت ازبیلا تھی۔دونوں نے باہم شادی کر لی اور ساری طاقت اکٹھی کر کے غرناطہ پر حملہ کر دیا۔ مسلمان بہت تھوڑے تھے مگر پھر بھی ہمت والے تھے اور اسلامی اثر ان پر تھا۔ مقابلہ بڑا سخت کیا مگر آخر محاصرہ کی حالت ہو گئی سات ماہ تک محاصرہ جاری رہا اور پھر خوراک میں بھی کمی ہونے لگی اس وقت وہاں کے بادشاہ ابو عبد اللہ محمد بن سلطان ابو الحسن ناصری تھے انہوں نے مجلس مشاورت منعقد کی کہ کیا کیا جائے۔اکثر لوگوں کا مشورہ یہی تھا کہ صلح کر لی جائے مقابلہ فضول ہے کیونکہ ہم مقابلہ کر نہیں سکتے۔

موسیٰ بن غسان سوار فوج کے جرنیل تھے انہوں نے کہا کہ صلح کی بات فضول ہے۔ عیسائیوں کو بتا دو کہ مسلمان تلوار اور خنجر اور گھوڑے پر چڑھ کر لڑنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔ اگر مسیحی بادشاہ ہمارے ہتھیاروں کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ آکر ہم سے جبراً چھین لے لیکن اسے معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے ہتھیار اسے بہت مہنگے پڑیں گے۔ میرا تو یہ حال ہے کہ غرناطہ کی فصیل کے نیچے کی قبر مجھے غرناطہ کے پُرتکلف مکانوں کی رہائش سے زیادہ عزیز ہے۔ جس میں مجھے کفار کی اطاعت میں رہنا پڑے۔ لوگوں پر ان کی باتوں کا اثر ہوًا اور جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ ہوا اور باہر نکل کر حملے شروع کئے مگر کجا ایک شہر اور کجا سارا ملک۔ مسلمان کثرت سے شہید ہونے لگے اور محاصرہ لمبا ہو گیا یہاں تک کہ سردی کا موسم آ گیا اور خوراک کا ذخیرہ ختم ہونے لگا آخر ابو القاسم گورنر غرناطہ نے رپورٹ کی کہ ذخائر خوراک ختم ہونے کو ہیں اور لوگوں میں گھبراہٹ پیدا ہو رہی ہے لیکن موسیٰ نے پھر صلح کی مخالفت کی اور باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کرنے کی رائے دی اور پھر باہر نکل کر مقابلہ شروع ہوًا لیکن پیدل سپاہ کو شکست ہوئی اور لشکر اسلام پھر قلعہ میں محصور ہو گیا۔ پھر صلح کی کانفرنس ہوئی۔ پھر موسیٰ نے مخالفت کی اور کہا کہ ہر مرد کو ہتھیار دو کہ وہ نکل کر مقابلہ کرے اور مَیں تو غرناطہ کی حفاظت میں لڑ کر مر جانا پسند کروں گا مگر مغلوب ہونے کو ہرگز برداشت نہ کروں گا لیکن اس دفعہ ان کی بات کا اثر نہ ہوًا اور ابو القاسم وزیر کو صلح کی شرطیں طے کرنے کو بھجوایا گیا اور وہ یہ شرائط طے کر کے آئے کہ ستر دن لڑائی بند رہے گی۔ اس اثناء میں اگر مسلمانوں کو افریقہ سے مدد پہنچ گئی تو وہ لڑائی جاری کر دیں گے ورنہ ہماری ماتحتی میں رہیں گے۔ ان کی مساجد کا احترام کیا جائے گا، اسلامی مدارس جاری رکھے جائیں گے، کسی عیسائی یا یہودی کو ان پر حاکم نہیں مقرر کیا جائے گا۔ وزیر جب یہ شرائط معلوم کر کے واپس آیا تو سب نے ان کو پسند کیا مگر ہزار سال کی حکومت کے بعد اس طرح حکومت کھونے کے خیال سے کئی عمائد رو پڑے۔

موسیٰ کھڑے ہوئے اور کہا کہ اے سردارانِ قوم اس رونے کے کام کو عورتوں اور بچوں کے لئے رہنے دو ہم مرد ہیں ہمارا کام آنسو بہانا نہیں خون بہانا ہے۔ بے شک لوگوں میں مایوسی پھیلی ہوئی ہے مگر ابھی ایک راستہ شرفاء کے لئے کھلا ہے اور وہ یہ کہ لڑ کر مر جائیں۔ زمین ہماری لاشوں کو سنبھالنے کے لئے موجود ہے اور اگر وہ بھی نہ ملے تو آسمان ہماری قبر بننے کے لئے کافی ہے۔ خدا تعالیٰ ہم کو اس طعنے سے بچائے کہ یہ لوگ اسلامی حکومت کے بچانے سے موت کے ڈر کی وجہ سے رک گئے۔ ان کی یہ تقریر سن کر بادشاہ نے کہا کہ یہ میری بد قسمتی ہے کہ اس ملک میں اسلام کی تباہی میرے ہی زمانہ میں مقدر تھی مگر امراء پر اس پُرحسرت کلام کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور وہ صلح نامہ پر دستخط کرنے کے لئے تیار ہو گئے تب موسیٰ پھر جوش سے کھڑے ہوئے اور کہا کہ اپنے آپ کو دھوکا نہ دو اور یہ خیال نہ کرو کہ عیسائی صلح کے شرائط کی پابندی کریں گے۔ موت تو سب سے کم خطرہ والی شے ہے۔ صلح کے بعد ہمارے شہروں کا تباہ کیا جانا، مسجدوں کی بے حرمتی، گھروں کی تباہی، ہماری بیویوں اور لڑکیوں کی عصمت دری، ظلم اور بے انصافی، زنجیریں اور کوڑے اور قید خانے، دہکتی ہوئی آگ میں جلایا جانا مجھے نظر آ رہا ہے۔ اور وہ لوگ جو زندہ رہیں گے ان امور کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ باقی رہا مَیں سو خدا کی قسم ہرگز اس دن کو نہیں دیکھوں گا۔ یہ کہہ کر موسیٰ بن غسان اٹھے اور بغیر کسی سے مخاطب ہوئے اپنے گھر گئے اور ہتھیار لگا کے گھوڑے پر سوار ہوئے اور شہر سے باہر نکل گئے۔ اسلامی تاریخ کہتی ہے کہ اس کے بعد پھر کسی نے ان کو نہ دیکھا مگر مسیحی مؤرخ فرے انٹونیو گائیڈا لکھتا ہے کہ اسی دن ایک دستہ پندرہ سواروں کا دریا کے کنارے چکر لگا رہا تھا کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک مسلمان ہتھیار لگا کے ان کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے انہوں نے اسے کھڑا ہونے اور اپنے آپ کو ان کے حوالے کرنے کے لئے کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا او ربڑھ کر ایک سوار کو مار گرایا اس پر لڑائی شروع ہو گئی اور یہ سوار زخموں اور چوٹوں سے بالکل بے پرواہ تھا

اس کی ایک ہی غرض معلوم ہوتی تھی کہ جس قدر عیسائی سواروں کو مار سکے مار دے۔اسے فتح کا خیال نہ تھا اسے صرف دشمن کو مارنے کا خیال تھا۔قریباً آدھا دستہ سواروں کا اس نے مار گرایا آخر سخت زخمی ہوا اور اس کا گھوڑا بھی زخمی ہو کر گر گیا لیکن وہ پھر بھی لڑتا رہا اور زمین پر گرا ہوا گھٹنوں کے بل اس نے لڑائی جاری رکھی اور آخر جب بالکل چُور ہو گیا تو دریا میں کود کر ڈوب گیا۔یہ ماننا کہ موسیٰ دریا میں خود کُودے ناممکن ہے کیونکہ مسلمان خودکشی کو جائز نہیں سمجھتے۔ پس بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یا تو وہ تڑپ کر گر گئے یا ذلیل مسیحی سپاہیوں نے اُن کو غصہ میں دریا میں دھکیل دیا۔یہ تھا سپین کا آخری مخلص جس نے آرام کے دنوں میں ہی خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق نہ رکھا بلکہ مصیبت کے وقت بھی اُس کو نہ چھوڑا۔خدا تعالیٰ کی رحمت اس اسلام کے سپاہی پر ہو۔مسلمان بادشاہوں کو بھول سکتے ہیں مگر اسلام کے اس بہادر سپاہی کو نہیں بھول سکتے۔جب تک ایک سچے مسلمانوں کی رگوں میں ایمان کا خون جاری ہے اس وقت تک موسیٰ بن غسان کا ذکر بھی نیکی اور دعا کے ساتھ جاری رہے گا۔ ایسے ہی لوگوں کے حالات نوجوانوں کے اندر ہمت اور عزم پیدا کرتے ہیں اور مَیں جماعت کے نوجوانوں سے خصوصاً اور دوسرے احباب سے عموماً یہ کہوں گا کہ اعلیٰ درجہ کا خلق یہی ہے جس کی مثال موسیٰ نے پیش کی اور وہ اسے اپنے اندر پیدا کریں۔خوشی اور مصیبت دونوں حالتوں میں خدا تعالیٰ کو خوش رکھنے کی کوشش کریں۔رسول کریم ﷺ تو صحابہؓ سے بیعت میں یہ عہد لیتے تھے کہ عُسر اور یُسر دونوں حالتوں میں فرمانبرداری کروں گا اور یہی سچا ایمان ہے اور جس کے اندر یہ نہیں وہ مُنہ سے تو مومن ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے مگر حقیقت میں وہ ایماندار نہیں ہے۔" (الفضل 27 مارچ 1941ء)

---

1 البقرۃ: 246

2 یہ حضرت خباب بن الارت تھے۔الاستیعاب جلد2 صفحہ 21-22 مطبوعہ بیروت 1995ء

3 یہ مقدمہ 28 جنوری 1903ء کو رائے سنسار چند مجسٹریٹ کی عدالت میں دائر ہوا

جو بعد میں لالہ چندو لال مجسٹریٹ درجہ اول گورداسپور کی عدالت میں منتقل ہو گیا۔اس مقدمہ میں مجسٹریٹ نے حضور کو پانچ سو روپیہ جرمانہ کی سزا دی۔
ہائیکورٹ میں اپیل پر حضور کو باعزت طور پر رہا کر دیا گیا اور جرمانہ واپس کر دیا گیا۔ (تاریخ احمدیت جلد سوم صفحہ 289 تا 310)

4 بخاری کتاب المغازی باب حدیث کعب بن مالک